

اسلام اور وطنیت

از جناب لوی صدیق الدین صاحب صلاحی

[پچھلے دنوں قومیت اور وطنیت پر جو گرما گرم بحثیں ہو چکی ہیں، ان سے اس مضمون کو کوئی تعلق نہیں۔ یہاں ان فطری نزاعات سے بالکل صرف نظر کر کے وطن کے متعلق اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ کوئی محتاج توضیح چیز نہ تھی اور اس عنوان پر قلم اٹھانا خواہ مخواہ ایک ایسے سلسلے کو اہمیت دیدینا ہے جو مسلمان کی نگاہ میں کبھی اہم نہ تھا، مگر زمانہ کی ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ اس سبب حقیقت چیز کو حقیقت کی حد تک پہنچا دیا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان علی الاعلان اسے حقیقت ہی کی حیثیت سے قبول کرتے جا رہے ہیں حتیٰ کہ اب تو اسلام اور وطن پرستی ایک کر کے رکھ دی گئی ہے]

حب وطن اور وطنی مصیبت نئی چیزیں نہیں ہیں۔ آغاز تمدن سے چلی آ رہی ہیں لیکن عملاً جتنا فروغ اور ترقی انہیں نئی تہذیب نے بخشا ہے پرانی دنیا اس کا تصور بھی نہ کر سکی ہوگی۔ اب وقت کی فیاضی نے وطن کو وہ تمام حقوق سے دیے ہیں جو کسی موجودہ ہستی ہی کے نمایاں شان ہو سکتے ہیں یعنی وطن ہی وہ چیز ہے جس کی حرمت، خدمت، حمایت اور تقدیس شرف انسانی کی آخری معراج اور نظام حیات کے دائرہ کار مرکزی نقطہ ہے۔ اصول اخلاق، آئین ریاست، ضابطہ تہذیب اور قانون معیشت و معاشرت متعلق حقایق کے بجائے وقتی مفروضات ہیں جو وطنی مصالح کے اشارہ پر ہر آن اودتے بدلتے رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ خدا میرے وطن کے ساتھ ہے کوئی کہتا ہے میرا وطن خدا کا اپنا وطن ہے۔ اور کوئی یہ کہہ کر کہ میرا وطن ہی خدا ہے، آگے بونی بولنے والوں کی زبان ہی بند کر دیتا ہے۔ گویا پہاڑ اور دریا صرف زمین ہی کے خطوں کو الگ نہیں کرتے بلکہ انسانیت کے

مفہوم کو بدل دیتے ہیں۔ خدائی تک کو تقسیم کر ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب وطن کی عظمت و کبریائی کا یہ عالم ہے تو اس کی محبت اور خصیبت مقدس ترین جذبہ کیوں نہ ہو؟ اس کی پرستش روشن خیالی کا منتہی کیوں نہ ٹھہرے؟ اس کی راہ میں لڑنے والا غازی اور مجاہد کیوں نہ مانا جائے؟ اور اس کی آن پر سر دینے والا شہید اور زندہ جاوید کیوں نہ کہا جائے؟۔

ہندو نیا نے وطن کے ان حقوق کی حمایت میں اتنا شدید پروپیگنڈا کیا کہ مشرق کی نیم مہذب اقوام کو ان کی واقعیت کے آگے تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ اسلامی ممالک کے وہ حصے جو اس سرخوشہ تہذیب سے نسبتاً زیادہ قریب تھے سب سے پہلے انہوں نے عملاً اس تصور کو قبول کیا اور خدا جانے مغرب کے اس ظاہر فرسا اور ہلاکت بداماں تصور کی گرفت سے ان کے ذہن کب آزاد ہوں گے لیکن اب تو اس ذہنی غلامی کا ماتم کرنے کے لیے ہمیں نہ اصفہان جانے کی ضرورت ہے نہ انقرہ، یہ روہماہ کی دیواروں کو توڑ کر ہندوستان میں بھی داخل ہو چکی ہے اور طوفان کی سی تیزی کے ساتھ پھیلتی جا رہی ہے، اور جو ایک دھڑکتے اور نیم جان بندہ ہماری امیدوں کا آخری سہارا تھے کہ وہ اس رو کو روکیں گے، وہ بھی راہ سے ہٹے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ تو وہ ہیں جو علیٰ وجہ البصیرت اسے اسلام کے خلاف سمجھ رہے ہیں لیکن آنادی کے جوش اور سیاست حاضرہ کے مصالح نے ان کی زبانیں گنگ کر دی ہیں۔ دوسرا گروہ ذرا ان سے زیادہ روشن خیال اور ساتھ ہی ”جبری“ اور ”باحیثیت“ بھی ہے۔ اس سے غیر مسلموں کا یہ طعنہ کہ مسلمانوں میں وطن کی محبت نہیں وہ بھارت ماما سے زیادہ عریک در در رکھتے ہیں ”سہانہ گیا اور اس نے اس دخر اش طعنہ کے جواب میں ط

کہ حب الوطن ہے نشاں مومنین کا

کا ترانہ گاتے ہوئے چیلنج کیا کہ جسے وطن پرستی کا دعویٰ ہو سامنے آئے اور بتائے کہ کس کی شریعت ”حب الوطن من الایمان“ کی تعلیم دیتی ہے؟ پھر اس سراسر مادہ پرستانہ جملہ کو ارشاد نبوی کی حیثیت سے اس قدر مشہور کیا گیا کہ اچھے اچھے ارباب فہم اس دھارے میں بہ گئے۔ اور اگر روایت نہیں تو معنی سے فطرت اسلام کی صحیح تہذیبی سمجھنے لگے۔

ظاہر ہے کہ جب وطن کی محبت جزو ایمان ہے تو وطن کی راہ میں لڑے اور مرے بغیر (یعنی جہاد کے) اور سر میں سودا شہادت رکھے بغیر، ایمان کی تکمیل کیوں کر ہو سکتی ہے۔ اور کسی مسلمان کے خلوص ایمان کے ثبوت میں اس کی وطن پرستی سے بڑھ کر اور کون سی دلیل ہو سکتی ہے؟

لیکن کیا حب وطن کے تعلق اسلامی نقطہ نظر یہی ہے؟ سطور ذیل میں ہم اسی سوال پر غور کرنا چاہتی ہیں، اور قطع نظر اس سے کہ فقہان قوم کیا کہتے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ خدا اور اس کا رسول کیا کہتا ہے۔

حب وطن کا وجود ایک بدیہی اور مسلمہ حقیقت ہے، ایسی بدیہی اور مسلمہ کہ اس پر عیسیٰ عقلی یا نقلی دلیل پیش کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہر انسان کی طبیعت بجائے خود اس پر گواہ ہے۔ اسے جتنا لگاؤ کافر کی فطرت سے

ہے اتنا ہی ایک مومن کی فطرت سے بھی ہے۔ اس کے وجود سے بڑے سے بڑے صاحب ایمان کا دل و دماغ خالی نہیں ہو سکتا۔ اس نے تو اپنے وجود کا اعلان اس قلب اور زبان سے کر لیا جسے مہبط وحی اور لسانِ وحی

کہا جاتا ہے۔ مکہ سے نکلتے وقت ایک طرف چشم مبارک سے غم و حسرت کے آنسو بہ رہے تھے، دوسری طرف زبان بے اختیار کہہ رہی تھی کہ اے مکہ تو مجھے ساری دنیا سے زیادہ عزیز ہے، پر کیا کروں تیرے ہی فرزند تیری آغوش

سے مجھے محروم کر رہے ہیں۔“ اور پھر بلال رضی اللہ عنہ وہ نعمت درد تو آج تک ضرب المثل ہیں جو ان کی مضطرب روح کی گہرائیوں سے یادِ وطن میں مکمل مکمل کر مدینہ کی پہاڑیوں میں گونجا کرتے تھے۔ غرض ایمان

یا عدم ایمان کوئی شے بھی اس جذبہ بشری پر اثر انداز نہیں ہو سکتی، بعینہ اسی طرح جس طرح ماں کی، باپ کی، بیٹی کی، بیوی کی، بھائی کی، بہن کی، احباب اور اقارب کی، کسی کی بھی محبت پر ان اعتقادی نزاعات کا کوئی اثر نہیں

پڑ سکتا۔ یہ تو سب کے سب خاص بشری جذبات ہیں جو بلا لحاظ کفر و ایمان بنی نوع انسان کی سرشت میں صنایع ازل سے

اس وقت سے ودیعت رکھے ہیں جب خود انسان کو ان کے وجود کا احساس بھی نہ تھا۔ چنانچہ قرآن حکیم خود اس حقیقت کو تسلیم کر کے فطرتِ انسانی کی ساخت کے متعلق فرماتا ہے :-

زُئِنَّا لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهْوَاتِ مِنَ بَنِي نُوْحٍ اِنْسَانٌ كُوْفِرًا مَّرغُوْبَاتٍ دَنُوْیٰ یٰمَنِیُّ یٰوِیُّوْنَ،

النِّسَاءَ وَالْبَيْنِينَ وَالْقَنَاطِيرَ الْمُقْتَضِرَ مِنَ
الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ
وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ الخ (آل عمران، رکوع ۲)

بیٹوں، سونے چاندی کے بٹے بڑے ڈھیروں، عمدہ عمدہ
گھوڑوں، مویشیوں اور کھیتوں کی محبت بھی معلوم
ہوتی ہے۔

وطن کی محبت بھی اس "حُبِّ الشَّمَهْوَلِيَّةِ" کے دائرہ سے خارج نہیں۔ حُبِّ شہوات سے مراد ہے مادیات
کی محبت۔ وطن کی محبت بھی دیگر تعلقات دنیوی کی طرح ایک مادی اور دنیوی تعلق کا نام ہے۔ بلکہ اگر گہری نظر
دیکھا جائے تو انہیں تمام اشیاء کی محبت ہی حب الوطن کی محرک اور علت بلکہ عین حب وطن ہے۔ انسان جس
ماحول اور سوسائٹی میں، جن احباب اور متعلقین کے درمیان اور جن لوازم زندگی کے ساتھ رہتا رہتا ہے، ان سے
اسے ایک خاص انس پیدا ہو جاتا ہے، اسی انس کا دوسرا نام حُبِّ وطن ہے۔ اس انس کے وجود کو قرآن تمام
نوع انسانی یعنی "النَّاسِ" کی جبلت میں مرکوز بتاتا ہے۔ اس "النَّاسِ" کے فرد جس طرح ابولہب اور ابوسہب
ہیں اسی طرح صدیق اکبر اور فاروق اعظم بھی۔ کسی کی خلقت "ذِينَ لِلنَّاسِ" کے حکم عام سے باہر نہیں ہے۔
پھر ان عام جذبات انسانی کو کفر و ایمان کے جھگڑوں سے کیا تعلق ہے؟

مادی تعلقات کے تعلق اسلام کا نظریہ | سب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حُبِّ وطن کے مخصوص تعلق کے بجائے

عام تعلقات دنیویہ کے بارے میں ہم اسلام کا نقطہ نظر سمجھ لیں۔ کیونکہ زیر بحث مسئلہ بھی اسی ضمن میں خود بخود حل ہو جائے گا
اور یوں بھی قرآن جب کبھی ان دنیوی تعلقات اور مادیات سے متعلق جذبات انسانی کے بارے میں کچھ فرماتا ہے
تو زیادہ تر ان کی مجموعی حیثیت کو ہی سامنے رکھ کر فرماتا ہے۔ کسی تعلق کی جداگانہ حیثیت اس کے دائرہ بحث میں
بہت کم آتی ہے۔

یقیناً جہاں تک ان جذبات کے نفس وجود کا تعلق ہے، وہ دیر درحرم کے جھگڑوں سے بے نیاز ہیں۔
وہ اپنا یہ حق ہر شیخ و برہمن سے حاصل کئے ہوئے ہیں۔ محل نزاع یہ نہیں ہے کہ یہ جذبات آدمی میں ہونے
چاہئیں یا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کی جائز حد کیا ہے، اور انسان کے نفس پر ان کے حقوق کس قدر ہیں۔

اسی سوال پر پہنچ کر اسلام اور جاہلیت کے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اسلام ہر مادی تعلق کو چند حدود سے مقید کرتا ہے اور جاہلیت انہیں توڑنے پر اصرار کرتی ہے۔ (حب وطن کے بارے میں بھی دونوں کے تصورات بالکل ایسے ہی جداگانہ واقع ہوئے ہیں۔ جاہلیت وطن ہی کو دین و ملت بلکہ خدا بھی سمجھ لے تو عبید نہیں، مگر اسلام وطن کی محبت کو نہ اتنی تقدیس کا مستحق سمجھتا ہے اور نہ اسے اتنے غیر محدود حقوق دیتا ہے)۔ اسلام دنیا کی تمام مرغوبوں سے خطا اٹھانے کی اجازت تو دیتا ہے لیکن اپنے نظام اور اصول کار میں کسی مادی شے کے اثر اور اقتدار کو قبول نہیں کرتا۔ بالفاظ دیگر وہ دنیا کو برتنے تو دیتا ہے، لیکن پوجنے نہیں دے سکتا۔ اس کے دستور العمل قرآن کے قریباً ہر صفحہ میں یہ وضاحت موجود ہے۔ چنانچہ آیت مذکورہ بالا کے آخری الفاظ ہی میں ارشاد ہوتا ہے:

ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَ حَسَنِ الْمَآبِ عٰیۡنِیْہِ دُنْيَا اُوْر اَسْ كِی تَمَام چِیْزِیْہِ جِن كِی طَرَف مِیْلَان اِنْسَان كِی نَطْرَت مِیْن دَاخِل ہِے، ”مَتَاعٌ قَلِیْلٌ“ ہِیْن۔ اِن سِے مَتَاعٌ تَوْضُرُوْر كِرہِ، لٰكِن اِنھِیْن كُو مَقْصُوْر وَا بِلذَات سَمَیْج كِر اِن كِی پَرْتَش مِیْن نِہ لَگ جَاؤ، تَمھَارِی نَزَلِ مَقْصُوْد اَس سِے بَلَنْد تر ہِے۔ اِن حِیَاتِ دُنْیَوِی كِی رِیْزُوْی پُر اَكْر تَم فَرْفِیْہِ ہُو گئے اُوْر اِنھِیْن كِے ہَاتھُوْی مِیْن اِن سِے نَطَام حِیَات كِی بَاگِیْن دِے دِیْن تُو یَقِیْن كِرُو تَم مَقْصُوْد حِیَات كِی تَكْمِیْل مِیْن نَاكَام اُوْر زَنْدگی كِی اَزْمَانَش گَاہ مِیْن فِیْل ہُو گئے۔ كِیونكہ ہَم نِے تھِیْن اَس وَا سَطِے ہِیْن پِیْدَا كِیَا كِر دُنْیَوِی مَلَأَق كِی مَسْرَتِیُوْی مِیْن غَرَق ہُو جَاؤ، بَلَكہ اَس اَزْمَانَش كِے یِے پِیْدَا كِیَا ہِے كہ اِن بَنْدَشُوْی كِے اِنْدِے ہِیْ كُوْن اِن سِی عَقْل اُوْر رُوْح كُو اَزَاد اُوْر زَنْدہ رَكھْتَا ہِے اُوْر اِن مِیْن كِر قَرَار ہُونِے كِے بجائے اِن كِے خُوش اَسْلُوْبِی كِے سَا تَم عَمْدہ بَرَا ہُو تَا ہِے۔

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ ۝
 وَيَبْلُوكُمْ اَبْسَ كُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝

وہ اللہ جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرتا ہے۔

اور یہ آزمائش اس وقت تک نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ اس امتحان گاہ (دنیا) کے اندر نبی آدم کے لیے مزلات اقدام نہ پیدا کیے جاتے۔ چنانچہ وہ پیدا کیے گئے اور اس کثرت اور قوت کے ساتھ کہ آدمی میں اگر حقیقی

بنیائی ہو تو اپنی کمزوریوں کے مقابلہ میں ان کی بے پناہی اور آفاق گیری کو دیکھ کر چیخ اٹھے۔ وہ مزلات کیا ہیں یہی مرغوباتِ نفس جن کی طرف آیت بالا میں اشارہ کیا گیا ہے، اور جن کا ایک جامع نام کتاب اللہ ہے۔ امتناعِ حیاتِ دنیا رکھا ہے۔ یہی متاعِ دنیا انسانِ طلوم و جہول کے لیے مزدا قدم ہے۔ یہ نہ ہوتی تو یہ عالمِ عنصری، دار ابتلا بھی نہ بنتا۔ اسی لیے انسان کو بار بار چوکتا رہنے کی تاکید کرتا ہے:-

فَلَا تَخْرُجُوا لِلْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَالَّذِينَ
پس تمہیں یہ نیوی زندگی (مصل مقصد اور انجام) کی طرف سے
دکھو میں نہ ڈالے اور نہ خدا باریس فریب کا شیطان تمہیں دھونڈے۔
(نعمان - ۲)

اور پھر یہی وہ خطرناک پہلو ان زخارفِ ارضی کا ہے جس کی وجہ سے انہیں قرآن میں جگہ جگہ "فتنہ" کہا گیا ہے، اِنَّهَا اَمْوَالُكُمْ وَاَفْلاَكُكُمْ فِتْنَةٌ (تغابن - ۲) وَاَعْلَمُوْا اَنَّ اَمْوَالَكُمْ وَاَفْلاَكُكُمْ فِتْنَةٌ

(انفال - ۳) "فتنہ" قرآنی اصطلاح میں ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن میں خیر و شر دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔ اگر انسان ان کے حدود و پہچان کران کا صحیح استعمال اور استفادہ کرے تو وہ اس کے لیے سراپا خیر ثابت ہوتی ہیں، لیکن اگر اس نے اس امتیاز اور استعمال میں غلطی کی تو یہی چیزیں اس کے حق میں شر بن جاتی ہیں، اور انسان اپنی آدمائش میں ناکام ہو کر معتبہ الہی قرار پاتا ہے، اور دنیا کی یہ ساری نعمتیں اس کے لیے دشمن ثابت ہوتی ہیں۔ اسی نقطہ نظر سے انہیں انسان کا عدو بھی کہا گیا ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَدْوَابِكُمْ وَعَدُوِّكُمْ نَكَرًا لِّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ (تغابن - ۲) یعنی اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور بچوں ہی میں سے تمہارے دشمن ہیں، پس ان کی محبت کے فتنوں سے بچتے رہو۔ کیونکہ انسان کے راہِ قسط و عدل سے ہٹنے کا سب سے بڑا واحد سبب یہی عشقِ مال اور حبِ عیال ہی تو ہے جو انسان کو ادائے فرض سے روکتا ہے۔

یہیں سے عملاً کافر اور ذمہ کا امتیاز شروع ہوتا ہے۔ کافر، مشرک اور ملحد انہیں چیزوں میں اپنے کو گم کر دیتے ہیں۔ یہ دنیا اور اس کے علائق ان کی روح کو، ان کے قلب کو، ان کے دماغ کو اپنی اسیری میں اس طرح لے لیتے ہیں کہ وہ انہیں کو حاصلِ زندگی اور منہائے حیات سمجھنے لگتے ہیں، یعنی شقاوت کے اس درجہ کمال

پر پہنچ جاتے ہیں جسے قرآن بَلْ تُؤْتِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا سے تعبیر کرتا ہے۔ اور ان کے برعکس مومن اس متاعِ ارضی کو اپنے دل و دماغ کا معبود نہیں بناتا۔ وہ ان سے ایک فطری رغبت تو ضرور رکھتا ہے مگر یہ رغبت اس کو اصل مقصد حیات سے بے گانہ نہیں کر سکتی۔ جہاں متاعِ دنیا نے معبودیت کا مطالبہ کیا اور مومن کے لیے وہ "عدو" کے حکم میں ہو گئی۔ پھر مومن کا فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے ہاتھ سے اس "عدو" کے حلق پر چھری پھیر دے، خواہ یہ چھری اس رغبت کے ساتھ ساتھ خود اس کے دل کے ٹکڑے ہی کیوں نہ کر ڈالے۔ بیٹے سے بڑھ کر اس آسمان کے نیچے اور کون سی چیز محبوب بنائی گئی ہے؟ لیکن جب اسی محبوب ترین متاع کو طوفان کی موجیں نکلنے کے لیے لے سکتی ہیں اور وقت کا سب سے بڑا خدا پرست انسان باوجود پیغمبرانہ غنیمت کے پدرانہ محبت سے مغلوب ہو کر بیتا بانہ کیسی بیٹے کو پکارتا ہے کہ يَا بَنِيَّ اَرَكِبُ مَعَنَا اور کبھی آسمان کی طرف مترجم نگاہیں اٹھا کر کہتا ہے کہ يَا دَيْتِ اِنَّ ابْنِي مِنْ اَهْلِي تو معلوم ہے کہ خدا کی بے نیاز عدالت سے اس درخواست کا کیا جواب ملتا ہے؟ عقیدت اور امتا کی اس فطری کشمکش پر پیغمبر کو کن لفظوں میں تنبیہ ہوتی ہے؟ صِدَا آتِي هَا بِكَ يَا نُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرٌ صَالِحٌ فَلَا تَسْتَسْئِلُنَّ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّي اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ (ہود - ۴۱) اے نوح! بیٹے کے ساتھ تمہاری شیفٹنگی مسلم، مگر یہ حق و باطل کے امتیاز کا وقت ہے، اس وقت تمہارے بشری جذبات کا اقتضار کوئی چیز نہیں۔ خبردار جذبات کے طوفان میں تمہارے پائے ثبات و استقامت کو نعرش نہ ہونے پائے اِنِّي اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ۔ حق کی راہ میں جو محبت حائل ہو اس کو دل میں رکھنا جاہلوں کا کام ہے، ایمان کی ہتھکان میں ناکام ہونے والوں کی راہ ہے۔ اس وقت بیٹے کی محبت ایک خطرناک فتنہ کی شکل میں تمہارے سامنے آئی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو اپنے پیروں سے کچل کر رکھ دو۔ حق پرستی کا دشمن ہو کر تمہارا بیٹا، تمہارا نخت ہونے کے باوجود، تمہاری کسی محبت اور سفارش کا مستحق نہیں، حتیٰ کہ وہ اب تمہارا بیٹا بھی نہیں کہا جاسکتا، لہذا تم اپنے اس جگر کے ٹکڑے کو نہنگ اجل کے منہ میں جانے دو۔

اسوہ ابراہیمی کو لیجیے۔ باپ بڑھ کر مخلصانہ ہمدردی اور عظیم کا مستحق کون ہے؟ لیکن جب تو حید پرست بیٹے کو یقین ہو جاتا ہے کہ باپ کی سیاہ فطرت پر شعاع حق کا انعکاس ناممکن ہے تو وہ نہ صرف اس سے ترک موالات کرتا ہے بلکہ اس کے لیے ہدایت اور مغفرت کی تمنا بھی اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے، اور بڑا بیٹے جیسا گہرا فطری (لیکن مادی) تعلق ایک منٹ کے لیے بھی اس کے ارادہ میں تزلزل نہیں پیدا کرتا۔ اور قریب آئیے، اسوہ فاروقی پر نگاہ ڈالیے کہ اس سراپائے ایمان کی سیرت بجائے خود حقیقت اسلام کی ایک مکمل اور خالص تصویر ہے۔ بدر کے میدان سے اسیران جنگ گرفتار ہو کر آتے ہیں۔ دربار نبوت میں معاملہ پیش ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ کیا کیا جائے۔ سب پہلے سیدنا عمرؓ کی آواز آتی ہے کہ یا رسول اللہ میں جانتا ہوں کہ ہمارے سامنے یہ سب ہمارے اپنے ہی دست و بازو بلکہ دل و جگر پانچویر کھڑے ہیں۔ لیکن میں یہ سب کے سب حق کے دشمن اور توحید سے برگشتہ۔ لہذا حکم دیجیے کہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے قریبی عزیز کی گردن مارے۔ کیونکہ ہمارے ان کے لاکھ نسبی اور وطنی تعلقات ہستی، مگر ایمان کے دشمن کسی صلہ رحمی، اور ان کی محبت کسی رعایت کی مستحق نہیں۔ اس مشورہ پر خواہ عمل نہ ہوا ہو لیکن اس معاملہ کے متعلق حاکم علیؓ کا جو فیصلہ آیا، اس کی روشنی میں کون ہے جو اس مشورہ کی ایمان نوازی اور صحت و عظمت کا منکر ہو سکے۔

اسلام اور ایمان کے ضابطہ میں مادی تعلقات اور بشری جذبات کی قدر اور رعایت جو کچھ ہے بس اتنی ہے۔ اس کے آگے اسلام کی سرحد ختم اور کفر کی مملکت اور اس کا آئین شروع ہو جاتا ہے جہاں یہی دنیا اور اسی دنیا کی لگاؤ میں ہی سب کچھ ہیں۔ ان حدود میں رہنے والے خدا کے پیدا کیے ہوئے ان تمام فتنوں کے سامنے سر جھکائے ان کی پریشانی میں دن رات مشغول رہتے ہیں اور دیدہٴ عبرت رکھنے والوں کو دکھاتے رہتے ہیں کہ دنیا کے تعلقات اپنی جائز حد سے گزرنے کے بعد کس طرح انسان کے دشمن بن جاتے ہیں اور ان میں ازواجکم و اولادکم وعدتکم

کی شکل کیا ہوتی ہے۔

خدا کی سنت یہی ہے کہ وہ انھیں فتنوں کے ذریعے اپنے فرمانبردار بندوں اور سرکش و نافرمان باغیوں کو الگ کیا کرتا ہے، اور کسی فریاد جماعت کو اس وقت تک اپنی مقبولیت کا شرف نہیں بخشا جب تک کہ وہ فتنوں کی اس بھٹی میں تپا کر جا چنچ نہ لیے جائیں، اور آزمائشوں سے یہ بات کھل نہ جائے کہ کھر کون ہے جو اپنے اصلی مقصد آفرینش کو یاد رکھتا اور دنیا کے سارے علائق پر اسے ترجیح دیتا ہے، اور کھوٹا کون ہے جو دنیا کے عشق میں سرشار ہو کر اپنے منہما سے غافل ہو بیٹھا ہے۔ اسی بات کو یوں فرمایا گیا ہے کہ:-

أَحْسِبَ النَّاسَ أَنْ يَتَذَكَّرُوا
أَمَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ (عنکبوت- ۱)

کیا لوگوں کو گمان ہے کہ وہ صراحتاً کہہ نہ سکیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے،
چھوڑ دیے جائیں اور ان کی آزمائش نہ ہوگی؟

یعنی ”فتنہ“ اور آزمائش کی راہ سے بہر حال گزرنا ہوگا تا کہ معلوم ہو جائے کہ کون مال و اولاد، اعزہ و اقارب اور گھر بار کے رشتوں کو اپنی فطری حد میں رکھ کر اللہ کے تعلق کو سب پر بالا و برتر رکھتا ہے، اور کون ایسے فریب کار ہیں جو نام تو توحید کا لیتے ہیں لیکن ان کے قلوب انھیں دنیوی رشتوں کی مضبوط گرفت میں جکڑے ہوئے ہیں، اور ضرورت کے وقت اس گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:-

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ
وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالْعَمَلِ
بِشْرِ الصَّابِرِينَ. (بقرہ- ۱۹)

اور ہم تمہیں کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جان اور پیداوار
کی کمی و ضرور آزمائشیں گی اور بے پیغمبران مضبوط صبر کرنے والوں
اور ہماری آزمائش میں پورا ترنے والوں کو فلاح کی خوشخبری سناؤ۔

اس آیت اور پہلی آیت (مُزَيِّنَ لِلنَّاسِ حُبَّ الشَّهَوَاتِ) دونوں کو ایک دوسری کی روشنی میں دیکھیے تو صاف نظر آتا ہے کہ جن چیزوں کی محبت انسانی سرشت میں رکھی گئی ہے انہی میں انسان کی اخلاقی طاقت کے لیے آزمائش بھی رکھ دی گئی ہے اور یہی آزمائش وہ فیصلہ کن چیز ہے جس سے خدا پرست اور دنیا پرست تمیز ہوتا ہے۔ سارے مادی علائق، دنیوی رشتے، اور بشری جاذبے اسی امتحان کے لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ انسانوں میں سے کون اتنا بودا اور کمزور ہے کہ ان کا

بندہ: وہ پرستار بن کر خدا کی محبت کو ان کی محبت پر سے قربان کر دیتا ہے، اور کس میں اتنی طاقت ہے کہ ان سب چیزوں کو اپنے لیے اور اپنے آپ کو خدا کے لیے سمجھے اور آزمائش کے وقت ہر ایک چیز کو خدا کی خوشنودی کے لیے قربان کر سکے۔ اسی لیے مومن کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اس کی جان اور مال یعنی اس کی پوری دنیا خدا کے ہاتھوں لپی ہوئی ہے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِآتٍ لَّهُمْ الْجَنَّةُ (توبہ - ۱۱۴) اور اگر کوئی مدعی ایمان اس ذوق تسلیم و رضا سے آتش نہیں تو وہ نیکی اور تقویٰ کا مقام رفیع ہرگز نہیں پاسکتا لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران - ۱۰۱) گویا اسلام نام ہی ہے قربانی کا، یعنی جان اور مال کی قربانی کا، مرغوباتِ نفس اور لذاتِ زندگی کی قربانی کا، مودتِ قرنیٰ اور حبِ وطن کی قربانی کا اور ان تمام دنیوی تعلقات اور مادی رغائب کی قربانی کا جن کی کشش اور محبت خالق کائنات کی طرف سے انسانی سرشت میں نمودی گئی ہے، وہی کشش اور محبت جس کے وجود کا اعتراف آیت ذٰلِكَ لِيُنظِرَ لَلنَّاسِ الْاٰخِرِ میں کیا گیا ہے۔

اب ان ساری تفصیلات کے بعد سوال پیدا ہو گا کہ آخر یہ تمام چیزیں، جن کی قربانی کا نام ہی قرآن کی اصطلاح میں اسلام ہے، کس چیز پر قربان کی جانی چاہئیں؟ بالفاظ دیگر انسان کا وہ منہ ہائے حیات اور اصل مقصد زندگی کیا ہے جس کے مقابل دنیا کی بڑی سے بڑی متاعِ محبوب ناقابل التفات اور فراموش ہو جانی چاہیے؟ اس کا جواب قرآن یہ دیتا ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاؤُكُمْ وَاَبْنَاؤُكُمْ
وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ
وَاَمْوَالٌ لِّقَتْرَفِئْتُمْ وَاَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ
كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنََهَا حَبَّتْ اِلَيْكُمْ
مِنْ اللّٰهِ وَرَسُوْلٍ وَّجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهِ

لے پیغمبر مسلمانوں کہہ دو کہ اگر تمہاری باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں
اور تمہارا خاندان اور تمہارا کمایا ہوا مال، اور تمہاری تجارت
جس کے مندا پڑ جانے کا تمہیں ٹلا اندیشہ رہتا ہے، اور تمہارا دل پسند
مکانات، یہ ساری متاعِ دنیوی تمہارے نزدیک خدا اور اس کے
رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں

فَاتَرْتَابُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ كَأَنَّ اللَّهَ لَا يَجْعَلُ
 الْفَعْمَ الْفَاسِقِينَ (توبہ-۳) فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔
 تو انتظار کرو یہاں تک کہ خدا اپنا حکم اور فیصلہ صادر کرے اور اللہ

غور فرمائیے، پھر انہیں متاعہائے ارضی کا ذکر ہے جنہیں گذشتہ آیات میں انسان کی مرغوب خاطر ظاہر کیا گیا تھا۔ یہاں بھی ان اشیاء سے انسان کی فطری دل بستگی کا نہ انکار کیا گیا ہے اور نہ اسے مذموم اور مخالف ایمان قرار دیا گیا ہے، بلکہ اشارتاً اس کا وجود بطور حقیقت مسلمہ کے تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ مطالبہ یہ کیا گیا ہے کہ عشق اور طلب اور سعی کا اصلی منہا صرف ذاتِ خداوندی ہے۔ جب تک دنیا کی رغبتیں خدا کے اس حق پر اثر انداز نہیں ہوتیں، انسان ان سے تعلق رکھنے میں حق بجانب ہے، اس پر کوئی گرفت اور الزام نہیں لیکن جت مال و دولت، یہ فرزند و زن، یہ خویش و اقارب، یہ نسل و خاندان، یہ دیار و وطن اور یہ سب سامان زندگی انسان کے لیے نفسِ روح اور زنجیرِ پابن جابیں اور محبوبِ حقیقی کی طلب و دعوت پر اسے حاضر نہ ہونے دیں تو ان سب چیزوں کی محبت حرام ہو جاتی ہے اور یہ حرام محبت کفر کا سرخیمہ ہے، جس طرح خدا کی طلبتِ محبت کو قربان کر دینا اسلام کا سرخیمہ ہے۔

خدا کی محبت اور عشق ایک باطنی کیفیت کا نام ہے اور اس کی خارجی تفسیر یا اس کا منظرِ عبادت ہے، یعنی دائماً خدا کی خوشنودی کے مطابق عمل کرنا۔ اصل شے کو آپ ایمان سے اور اس کے منظر کو اسلام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہی ایمان، انسانی ضابطہٴ حیات کی تشکیل میں اساس کی حیثیت رکھتا ہے اور اس اساس پر جو عمارت کھڑی ہوتی ہے، اسی کا نام اسلام ہے۔ گذشتہ آیات میں جس چیز کے لیے دنیا اور اس کے تعلقات کی قربانی کا ذکر ہے وہ یہی "اساس" اور یہی "عمارت" ہے۔ قرآن دنیا کی محبوب سے محبوب چیز کو بھی یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس عمارت کی صحیح تعمیر میں خلل انداز ہو اور اس کی وجہ سے اس میں رخنے پڑیں۔ وہ اسے تو تسلیم کرتا ہے کہ دنیا اور اس کی ساری متاع سے انسان تعلق رکھے اور اسے پوری طرح لطف اندوز ہو، اور تسلیم کیا معنی وہ تو اس پر زور دیتا ہے مگر ساتھ ہی اس کا یہ بھی مطالبہ ہے

کہ جب کبھی ایمان اور اسلام کے مصالح سے اس دنیا کے کسی بڑے سے بڑے تعلق کے مصالح متصادم ہوں تو انسان کو اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ ایسے تعلق کو نہایت صبر و سکون کے ساتھ توڑ دے خواہ وہ موجودہ تہذیب کا ”صنیم اکبر“ ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہ دنیا انسان کے بستے کے لیے بنائی گئی ہے نہ کہ پوجنے کے لیے۔ خادم بنائی گئی ہے نہ کہ آقا۔ تابع اور مسخر بنائی گئی ہے نہ کہ الہ اور معبود۔ اللہ دنیا خلیقت لکم وانتم خلقتم للاخرة۔

مادی تعلقات اور بشری جذبات کے متعلق قرآن کا اجمالی طور پر یہی اصولی نظریہ ہے۔ آئندہ ہم اسی اصل کی روشنی میں مخصوص طور پر وطنیت کے متعلق اسلام کے نقطہ نظر کی وضاحت کریں گے۔

(باقی)

مسلمانوں کے دینی زندگی اور کردار کی تاریخ نامہ

نوٹ کا پرچہ مفت ”خالہ“ قیمت فی پرچہ (۲۰۰)

جو اکابر علماء ہند بالخصوص حضرت مولانا الحاج محمد امجد علی صاحب دیندار العلوم دیوبند کی زیر قیادت نہایت آہستہ آہستہ کے ساتھ ہر مہینہ شائع ہوتا ہے جس میں بزرگان و علماء کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اسلامی تمدنی تاریخی مقالے نظم و شریعتی نظریات ہوتے ہیں۔ اپنے بلند پایہ مقالات کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں یہ ایک سالہ جواحد و بہریت پر تن دہا میں مسلمانوں کی متاع ایمانی کی حفاظت کرتا ہی اکابر علماء ہند کے نامور و غیر مطبوعہ علوم و معارف صرف اس سالہ کی اوراق زمینت ہوتے ہیں، رسالہ ”خالہ“ کا مطالعہ مسلمانوں کو ہر طبقہ کیلئے رشد و ہدایت کا ذریعہ اور دینی، دنیوی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ قیمت سالانہ مع محصول ڈاک ذریعہ مئی آرڈر پیشگی :- مساویں خاص ۵۰/- عام خریداروں کے لیے طلباء سے ۳۰/-

جملہ مراسلات و ترسیل زر کا پتہ :- (دہلی) سید احمد علی صاحب رسالہ ”خالہ“ دیوبند (دہلی)